طبقۂ مترفین اور اسلام کا نظامِ عدل

مولانا گوہر رحمٰن

(چھٹی اور آخری قسط)

زکوٰۃ کے علاوہ کسی حق کے واجب نہ ہونے کے بارے میں احادیث رسولؐ کا صحیح مفہوم

قرآن و سنت اور سنّتِ خلافتِ راشدہ سے تو ثابت ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں جو بعض اوقات واجب ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی وصولی جبراً بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن بعض صحیح احادیث میں آیا ہے کہ مسلمان جب زکوٰۃ ادا کر لیتا ہے تو اس پر مزید کوئی حق واجب نہیں ہوتا' اور اگر عاملین' مقررہ شرح سے زائد زکوٰۃ وصول کرتے ہیں تو ظلم کرتے ہیں' اور زکوٰۃ دینے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقررہ مقدار سے زائد زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کردیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن و سنت میں تناقض تو نہیں ہے' اس لیے زائد از زکوٰۃ کے عدم وجوب پر دلالت کرنے والی احادیث کا صحیح مفہوم معلوم کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے:

> مسلمانوں کے اموال میں حقوق مقدرہ راتبہ تو زکوٰۃ و عشر کے علاوہ واجب نہیں ہیں مگر حقوق غیر مقدرہ غیر راتبہ اور بھی ہیں جو بعض اوقات واجب ہو جاتے ہیں اور جبراً وصول کیے جا سکتے ہیں۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ زکوٰۃ و عشر اور دیگر شرعی واجبات کی شرح ادائیگی شرعاً" مقرر ہے' اور اس کا ادا کرنا ہمیشہ کے لیے فرض ہے۔ یہاں تک کہ اگر بالفرض زکوٰۃ کا مستحق موجود نہ ہو پھر بھی یہ فرض ساقط نہیں ہوتا بلکہ بیت المال میں زکوٰۃ جمع کرنی ہوگی جس طرح نماز روزہ ایک دائمی عبادت ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی ایک دائمی عبادت ہے۔ نہ یہ ساقط ہو سکتی ہے اور نہ اس کے نصاب اور مقدار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا دائمی اور مقررہ مقدار کا مالی حق یقیناً زکوٰۃ کے علاوہ واجب نہیں ہے۔ لیکن کچھ حقوق ایسے ہیں جو مستقل طور پر ہمیشہ کے لیے واجب نہیں ہیں اور ضرورت کے ختم ہونے پر ان کا وجوب بھی ساقط ہو جاتا ہے۔ نہ ان حقوق کی مقدار متعین ہے اور نہ یہ ہمیشہ کے لیے مستقل طور پر عائد کیے جاتے ہیں' بلکہ حالات کے مطابق ان کی

مقدار اور وجوب کا فیصلہ کیا جاتا ہے ۔ مثلاً رشتہ داروں کا نفقہ ' فقراء و مساکین کی بنیادی ضروریات پوری کرنا (اگر زکوٰۃ سے پوری نہ ہو سکیں)' دارالاسلام کے دفاع اور جہاد کے اخراجات پورے کرنا (اگر زکوٰۃ سے پورے نہ ہو سکیں) ' اور عوام کو سہولتیں فراہم کرنے اور قومی ترقی کے لیے بقدرِ ضرورت اغنیاء کے مال پر ٹیکس عائد کرنا۔ یہ وہ مدات ہیں جن کے لیے بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت مزید مال لیا جاسکتا ہے' دلائل پہلے عرض کر دیے گئے ہیں۔ زائد از زکوٰۃ کے واجب نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مقررہ مقدار میں اور ہمیشہ کے لیے واجب نہیں ہے ۔ ان احادیث کا یہی مفہوم ابو حیان اندلسی" نے بیان کیا ہے (البحرالمحیط' طبع ۱۹۸۳ء' ج ۲ ص ۵)۔ علامہ آلوسی" اور علامہ انور شاہ کشمیری" نے بھی یہی مفہوم بیان کیا ہے (روح المعانی' ج ۲' ص ۴۷' فیض الباری' ج ۳' ص ۵)

(۹) جہاد بالمال اور دارالاسلام کے دفاع کے لیے خرچ کرنا

مسلمانوں پر صرف اپنی ضروریات اور عوام کی انسانی ضروریات پوری کرنا ہی لازم نہیں ہے' بلکہ اسلام کے غلبے اور تبلیغ و دعوت کے لیے جہاد بالمال بھی لازم ہے ۔ اسلام اور دارالاسلام کا تحفظ بھی مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے ۔ قرآنِ کریم میں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں کا حکم دیا گیا ہے ۔ جس طرح نماز روزہ کی بدنی عبادت ادا کرنے سے زکوٰۃ و عشر اور دوسرے مالی فرائض ساقط نہیں ہو سکتے' اسی طرح جہاد بالنفس کی بدنی عبادت ادا کرنے سے جہاد بالمال کی مالی عبادت ساقط نہیں ہو سکتی ۔ البتہ اگر زکوٰۃ سے جہاد اور دفاع کے اخراجات پورے ہو سکتے ہوں تو مزید مالی امداد واجب اور فرض نہیں ہو گی ' بلکہ صرف مستحب ہو گی ۔ لیکن اگر جہاد اور دفاع کے اخراجات زکوٰۃ سے پورے نہ ہو سکیں ' اور مال، وسائل کی کمی کی وجہ سے ملک کی سلامتی خطرے میں پڑجائے یا جہاد کے عمل میں کمزوری آجائے ' تو ایسی صورت میں بقدرِ ضرورت اور بقدرِ استطاعت زکوٰۃ و عشر سے زائد مال دینا اور وسائل فراہم کرنا واجب ہو جاتا ہے ' اور حکومت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگ رضا کارانہ طور پر جہاد فنڈ میں اپنی اعانتیں داخل نہ کریں تو وہ زبردستی وصول کر کے جہاد کے مصارف پورے کرے ۔

آیاتِ قرآنیہ

" اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور مت ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں" (البقرہ' ۲ : ۱۹۵)

ابنِ کثیرؒ اور قرطبی" کی نقل کردہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں اپنے آپ کو

ہلاکت میں ڈالنے سے مراد جہاد بالمال کا ترک کرنا ہے۔ جب دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں لڑنا چھوڑ دیا جائے' اور دفاعی اخراجات کے لیے مال خرچ کرنا بھی چھوڑ دیا جائے' تو دشمن غالب آجائے گا اور مسلمان ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔

"اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے بھی اور اپنی جانوں سے بھی "(التوبہ' ۹ : ۴۱)

"بے شک مومن تو وہ ہیں جو ایمان لائے ہوں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر' پھر شک میں نہ پڑے ہوں' اور جہاد کرتے ہوں اپنے مالوں سے اور جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں (الحجرات' ۴۹ : ۱۵)

"ایمان لاؤ تم اللہ پر اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور جانوں سے"(الصف' ۶۱:۱۱)

احادیثِ نبویہ[۱۵]

"ابو امامہ باہلیؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا' جس مسلمان نے نہ تو خود کفار کے مقابلے میں لڑائی لڑی ہو' نہ غازی کو سامانِ جہاد دیا ہو' اور نہ غازی کے اہلِ خانہ کی خبرگیری کی ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر قیامت سے پہلے ہی کوئی مصیبت نازل فرما دے گا" (ابوداؤد' کتاب الجہاد)

"ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا' جس کے پاس ایک درہم یا ایک دینار یا سونے چاندی کا ایک ٹکڑا ہو' جو اس نے قرض خواہ کے لیے نہ رکھا ہو' اور وہ اسے جہاد میں خرچ نہ کرتا ہو' تو یہ وہ خزانہ (کنز) ہے جس سے یہ شخص قیامت کے دن داغا جائے گا" (کتاب الجہاد' ابن ابی عاصم' ج ۱' ص ۲۷۸' مصنف ابن ابی شیبہ' ج ۳' ص ۲۱۳' سنن کبریٰ بیہقی ج ۴' ص ۱۴۷' سنن دار قطنی' ج ۲' ص ۱۰۰ - ۱۰۱)

حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے کہ جہاد بالمال فرض ہو چکا ہو' صرف مستحب نہ ہو۔ جب مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے دشمن کے غالب آجانے کا خطرہ ہو تو اس صورت میں اپنی بنیادی ضرورت اور قرض خواہ کے حق سے زائد مال امیر کے مطالبے پر جہاد فنڈ میں دینا واجب ہو جاتا ہے۔ اور مالی واجبات ادا نہ کرنے والوں کو قیامت کے دن شدید عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حدیث کی توجیہہ اس لیے کی گئی ہے کہ عام حالات میں ضرورت سے زائد مال وارثوں کے لیے بچا کر رکھنا ممنوع نہیں ہے۔

سنّتِ اصحاب رسولؐ

دورِ نبویؐ میں اصحاب رسولؐ کے اندر جذبۂ جہاد اور جذبۂ اطاعت بہت زیادہ تھا۔ اس لیے

جہاد کے مصارف کے لیے جبری وصولی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی ' بلکہ رسولؐ اللہ کا معمولی سا اشارہ بھی ان کے لیے کافی تھا۔ سیرتِ صحابہؓ اور جہاد سے متعلق کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ جہاد بالمال میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے ' صحابہؓ کے اس جذبے کا مثالی نمونہ رجب ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر دیکھنے کے قابل تھا۔ بہت طاقتور دشمن قیصرِ روم سے مقابلہ درپیش تھا' موسم سخت گرم تھا' راستہ طویل اور کٹھن تھا ' اور مالی لحاظ سے بشدید عسرۃ یعنی تنگدستی کی حالت تھی۔

رسولؐ اللہ نے مسجدِ نبوی کے منبر پر کھڑے ہو کر جب جہاد فنڈ میں مالی امداد کا حکم دیا اور ترغیب دلائی ' تو صحابہؓ نے صدقاتِ کثیرہ پیش فرما دیے ۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے اپنا سارا مال پیش کیا ' جو کل ۴ ہزار درہم تھا (ایک درہم ۷۰ جو کے دانوں کے وزن کے برابر ہوتا ہے یعنی ۳ ماشہ ۱/۵ ۱ رتی) حضرت عمرؓ نے اپنا آدھا مال دے دیا۔ ان کا یہ آدھا مال بھی ۱۰۰ اوقیہ چاندی یعنی ۴ ہزار درہم تھا (مسند احمد ' ج ۱' ص ۳۴۳ ' تاریخ ابن عساکر' ج ۱' ص ۱۱۱)

عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے ۸ ہزار درہم داخل کیے ۔ حضرت عباسؓ ' طلحہؓ ' سعد بن عبادہؓ اور محمد بن مسلمہؓ نے بھی اپنی استطاعت کے مطابق اس جہادِ مالی میں حصہ لیا۔ عاصم بن عدیؓ اور عامر انصاریؓ نے ۹۰ - ۹۰ وسق کھجوریں پیش کی تھیں (ایک وسق ۵ من ڈھائی سیر کا ہوتا ہے تو ۹۰ وسق کے ۴۵۵ من ۲۵ سیر بنتے ہیں) ایک انصاری صحابیؓ نے ' جسے ابو عقیل کہا جاتا تھا' رات کو ایک شخص کا کام کر کے دو صاع کھجوریں مزدوری میں لی تھیں ۔ ایک صاع اہلِ خانہ کے لیے گھر میں رکھ دیں ' اور ایک صاع جہاد فنڈ میں جمع کرا دیں ا(ایک صاع ۲۷۰ تولے کا ہوتا ہے) منافقین نے اس شخص کا مذاق بھی اڑایا (تاریخ ابن عساکر' ج ۱' ص ۱۰۶ - ۱۱۱)

لیکن مقدار اور کمیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ مال حضرت عثمان بن عفانؓ نے پیش فرمایا تھا۔ تین سو اونٹ بمعہ کمبلوں اور کجاووں کے ' اور ایک ہزار دینار رسولؐ اللہ کی خدمت میں پیش کیے۔ تو رسول اللہؐ نے فرمایا ' عفان کا یہ بیٹا اگر اس کے بعد اور کچھ بھی نیکی (نفلی) نہ کرے تو اس کے لیے کوئی نقصان نہیں ہو گا (مسند احمد' ج ۴ص ۷۵ و ج ۵ ص ۶۳' ترمذی فی المناقب ' التاریخ الکبیر ' امام بخاری ۳ - ۱ ص ۲۴۶ ' تاریخ الاسلام للذہبی' ص ۶۲۸ - ۶۲۹)

ابو یعلی الموصلی (م ۳۰۷ھ) نے عبد الرحمٰن بن عوفؓ کا قول نقل فرمایا ہے کہ عثمان بن عفانؓ نے جیش العسرۃ کو (تبوک) ۷ سو اوقیہ سونا دیا تھا ایک اوقیہ ساڑھے دس تولے کا ہوتا ہے تو

اس حساب سے ۳۵۰ء۷ تولے سونا بنتا ہے (مسند ابو یعلیٰ' ج ۲' ص ۱۶۱' مسند عبد الرحمٰن بن عوف)

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن عمر بن ابان آیا ہے جسے بخاریؒ' ابو حاتمؒ اور ابوزرعہؒ نے ضعیف کہا ہے۔ ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) نے حسن بصری کا قول نقل فرمایا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے غزوہ تبوک کے موقع پر ۹۵۰ اونٹ اور ۵۰ گھوڑے بھی دیے تھے (تاریخ الاسلام حصہ خلفائے راشدین ص ۵۷۰) لیکن اس کی سند میں بھی خلید بن دعلج السدوسی نامی راوی آیا ہے جسے دار قطنی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ زیادہ مشہور اور صحیح روایت یہی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ۳ سو اونٹ اور ایک ہزار دینار دیے تھے۔

جب صحابہ کرامؓ کے جذبہ انفاق فی الجہاد کا عالم یہ تھا تو زبردستی وصول کرنے کی اس وقت ضرورت کیا تھی؟

مذکورہ آیات واحادیث میں جہادِ مالی کا حکم دیا گیا ہے' اسے ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے' اور جہاد بالمال نہ کرنے والوں کو ہلاکت دنیوی اور عذاب اخروی کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واجبات شرعیہ اور مقتضیاتِ ایمانیہ میں سے ہے۔ ان آیات و احادیث میں زکوٰۃ کا نام نہیں لیا گیا ہے بلکہ عمومی الفاظ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے حکومت کا یہ حق بلکہ فرض ہے کہ اگر لوگ رضاکارانہ طور پر جہاد فنڈ میں کچھ نہ دیتے ہوں' اور ضرورت شدید ہو' تو بقدرِ ضرورت اور بقدرِ استطاعت جبراً وصول کرے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر قومی خزانہ خالی ہو یا اس میں اتنا مال نہ ہو کہ فوج کے اخراجات پورے ہو سکیں تو حکومت اغنیاء سے ضرورت کے مطابق مال زبردستی لے سکتی ہے۔ حنفیہ کے مشہور فقیہہ علامہ المرغینانی صاحبِ ہدایہ' امام شاطبیؒ اور ابنِ قیمؒ نے بھی اسی طرح لکھا ہے (المستصفی للغزالی' ج ۱' ص ۳۰۳ - ۳۰۴' ہدایہ مع فتح القدیر' ج ۷' ص ۲۲۲' الاعتصام للشاطبی' ج ۲' ص ۲۹۵ - ۲۹۶' زاد المعاد' الابن قیم' ج ۴' ص ۵۵۸)

(۱۰) مصالحِ عامہ اور دفاع کے لیے منصفانہ ٹیکس

گزشتہ صفحات میں دلائلِ شرعیہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زکوٰۃ و عشر کے علاوہ بھی مسلمانوں کے مال میں حقوق ہیں' اور جن احادیث میں آیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ کوئی حق واجب نہیں ہے ان کی یہ توجیہہ بھی بیان ہو چکی ہے کہ اس سے مراد مقررہ شرح کے ساتھ دائمی حق ہے جو مستقل طور عائد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی اصول کی روشنی میں رشتہ داروں کا خرچہ ادا کرنا'

بنیادی ضرورت سے محروم لوگوں کی کفالت کے لیے زکوٰۃ سے زائد مال دینا (اگر بالفرض زکوٰۃ کافی نہ ہو) ' اور جہاد کے اخراجات کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ مال دینا واجب ہے ' اور حکومت یہ مال قانوناً" وصول کرنے کا بھی حق رکھتی ہے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اور حکومت کا نظام چلانے کے لیے ٹیکس لگایا جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الف ۔ پاکستان میں ٹیکسوں کا مروّجہ نظام عادلانہ نہیں ہے

پاکستان میں ٹیکسوں کا ' بالخصوص انکم ٹیکس کا ' نظام منصفانہ نہیں ہے ' بلکہ ظالمانہ ہے۔ یہ نظام در اصل انگریز کی سامراجی اور استحصالی حکومت سے ورثے میں ملا ہے ' جسے انگریزوں کے یہ سیاسی شاگرد اب تک بحال رکھے ہوئے ہیں۔ اس نظام میں ٹیکسوں کا بوجھ مترفین اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں پر تو برائے نام پڑتا ہے ' تقریباً ۸۰ فی صد سے زیادہ بوجھ غریب عوام پر پڑتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اشیاء صرف پر عائد کردہ ٹیکس کا بوجھ صارفین ہی پر پڑے گا ۔ بلا واسطہ اور براہ راست ٹیکس تو برائے نام ہوتا ہے ' اصل ٹیکس بالواسطہ ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ قومی خزانے کو فضول خرچیوں اور عیاشیوں پر اڑایا جاتا ہے اور حقیقی ضرورت کے بغیر عوام پر ٹیکس لگا دیے جاتے ہیں۔ اس نظام میں بنیادی اور نتیجہ خیز تبدیلیوں اور اصلاحات کی ضرورت ہے۔

ب ۔ مصالح عامہ کے لیے ٹیکس لگانا "مصالح مرسلہ" میں شامل ہے

دور حاضر کی طرح ٹیکس عائد کرنے اور اس کا باقاعدہ ایک نظام بنانے کی دورِ نبوت میں اور دور خلافت راشدہ میں نہ کوئی مثال ملتی ہے اور نہ اس کی ممانعت اور عدم جواز کی کوئی دلیل ملتی ہے ۔ اگرچہ اس کے نظائر ملتے ہیں اور ان نظائر کی دلیلیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً جزیہ اور خراج کی مثالیں اور نظیریں موجود ہیں مگر ان دونوں کا تعلق غیر مسلموں سے ہے۔ فقہی اور قانونی زبان میں ایسے امور کو مصالح مرسلہ یا **استصلاح** کہا جاتا ہے ' جن کی قرآن و سنت اور اجماعِ صحابہؓ میں نہ ممانعت کی گئی ہو اور نہ ان کے جواز کی تصریح کی گئی ہو ۔ قرآن و سنت کی نصوص اور اجماع کی خاموشی کے وقت مصالح مرسلہ قانون سازی کا ایک ماخذ ہے۔ اسلامی حکومت کی مجلسِ شوریٰ حالات کے تقاضوں اور عوام کی بہبود کی خاطر مفاد عامہ سے متعلق جو مناسب سمجھے فیصلہ کر سکتی ہے اور قانون بنا سکتی ہے۔

عوامی مفاد اور قومی ترقی کے لیے ٹیکس لگانا بھی مصالح مرسلہ میں شامل ہے۔ اسلام میں اصولاً یہ جائز ہے ' اس لیے کہ اس کی ممانعت نہیں کی گئی ۔ عوام کی سہولت کے لیے سڑکیں بنانا ' ڈیم

بنانا ' نہریں بنانا ' شفاخانے بنانا ' سکول کالج اور یونیورسٹیاں بنانا ' مواصلات کا نظام قائم کرنا ' سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے ادارے بنانا ' بجلی اور پانی کی بہم رسانی کا نظام قائم کرنا اور اسے ترقی دینا ' ذرائع ابلاغ کا نظام قائم کرنا ' انتظامیہ ' عدلیہ اور مقننہ کا نظام قائم رکھنا اور اسے بہتر بنانا ' اور ریاست کے دفاع کے لیے تربیت یافتہ اور منظم فوج تیار رکھنا اور اسے جدید ترین عصری اسلحہ سے مسلح کرنا' یہ سارے کام وہ ہیں جو ظاہر ہے کہ مصالح مرسلہ اور مفاد عامہ سے تعلق رکھتے ہیں' اور یہ سارے کام ظاہر ہے کہ سرمائے کے بغیر جاری نہیں رہ سکتے۔ جب زکوٰۃ کے مصارف محدود ہیں ' تو آخر یہ سارے اخراجات ٹیکس لگائے بغیر کیسے پورے کیے جا سکیں گے ؟ عوام کے نمائندوں پر مشتمل مجلس شوریٰ عوام ہی کے مفاد و مصالح کے لیے بقدر ضرورت اور بقدر استطاعت منصفانہ ٹیکس لگا کر اور وصول کر کے جب یہ اخراجات پورے کرے تو اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے ' بلکہ ایسا کرنا مفید بھی ہے اور ضروری بھی۔

ج ۔ جو فائدہ اٹھاتا ہے وہ اس کا خرچہ بھی برداشت کرے

ٹیکس کا منصفانہ نظام قائم کرنے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ فقہاء نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ **الغرم بالغنم**' یعنی جو فائدہ اٹھاتا ہے وہ اس کا خرچہ بھی برداشت کرے۔ جب عوام اپنی حکومتوں سے سہولتیں مانگتے ہیں اور ان سہولتوں سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں' تو مذکورہ فقہی قاعدے کے مطابق ان کو ان سہولتوں کا خرچہ بھی برداشت کرنا ہوگا حکومت تو در اصل عوام کی وکیل اور خادم ہوتی ہے جو عوام سے ٹیکس وصول کرکے واپس انہی پر خرچ کرتی ہے ' اور اس آمد و خرچ کا ایک منظم اجتماعی نظم قائم کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام' مصلحت اور عقل دونوں کے مطابق ہے ۔ البتہ اگر ٹیکس غریبوں پر لگایا گیا ہو حقیقی ضرورت کے بغیر لگایا گیا ہو ' یا یہ ٹیکس عوام کی خدمت کی بجائے حکمران طبقے یا کسی اور طبقے کے مفادات پر خرچ ہو رہا ہو' جیسا کہ پاکستان میں ہو رہا ہے' تو پھر یہ ظلم ہے۔

مذکورہ قاعدہ مشہور حنفی فقیہہ احمد بن عمر الخصاف" (م ۲۶۱ھ) نے اپنی کتاب "شرح ادب القاضی" میں بھی ذکر کیا ہے (ج ۳' ص ۱۶۳ ۔ ۱۶۵)' اور مجلتہ الاحکام الحدیث کی دفعہ ۸۷ میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے ---- یہ قاعدہ در اصل ایک حدیثِ رسولؐ سے ماخوذ ہے کہ "**الخراج بالضمان**" "جو نقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے' فائدہ حاصل کرنا بھی اسی کا حق ہے' اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو فائدہ اٹھاتا ہے وہ اس کا تاوان بھی برداشت کرے ۔ یہ حدیث ابو داود ' ترمذی اور نسائی نے کتاب البیوع میں نقل کی ہے اور یہ مسند احمد میں بھی موجود ہے۔

د۔ مکس اور عشور سے ظالمانہ اور شاہی ٹیکس مراد ہیں

احادیث میں "مکس" اور عشور" کی جو مذمت آئی ہے' اور صاحبِ مکس کے لیے عذاب کی وعید کا ذکر ہوا ہے تو شارحینِ حدیث اور فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ اس سے جاہلیت کے بادشاہوں کے ٹیکس مراد ہیں' جو ظالمانہ تھے' غریبوں پر لگائے جاتے تھے' بلا ضرورت لگائے جاتے تھے' اور عوامی مفاد کی بجائے شاہ خرچیوں پر اڑائے جاتے تھے۔ اسلامی حکومت میں ٹیکس مجلسِ شوریٰ لگائے گی اور وہ عوامی مفاد پر خرچ ہو گا۔

ہ ۔ ٹیکس لگانے کے جواز کی شرائط

مفادِ عامہ کے لیے ٹیکس لگانے کی کچھ شرائط ہیں جن کو ملحوظ رکھنا لازم ہے۔

۱ ۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ مفادِ عامہ یا دفاع کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کی حقیقی ضرورت ہو' اور موجود وسائل کافی نہ ہوں ۔ مصر کے حکمران نے جب تاتاریوں کے مقابلے کا ارادہ کیا تو جنگی اخراجات کے لیے تاجروں سے قرض لینے کا فیصلہ کیا ۔ اس پر اس وقت کے سلطان العلماء عز الدین ابن عبدالسلام (م ۶۶۰ھ) نے کہا کہ "تمہارے اور تمہاری بیگمات کے پاس جو کچھ ہے وہ حاضر کرو' اور اپنے امراء کی بیگمات کے زیورات بھی لے آؤ اس لیے کہ سب حرام ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں' اس کے بعد اگر ضرورت باقی رہے تو پھر قرض لیا جا سکتا ہے۔ (طبقات الشافعیہ الکبریٰ' ج ۸' ص ۲۱۵)

اسی طرح جب الملک الظاہر بیبرس نے انہی تاتاریوں کے مقابلے کے لیے لشکر تیار کیا اور علماء سے دفاعی ٹیکس لگانے کا فتویٰ طلب کیا' تو امام نوویؒ (م ۶۷۶ھ) نے فرمایا "تمہارے پاس ایک ہزار غلام ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایسی خلعتیں ہیں جن پر سونا چڑھا ہوا ہے' اور دو سو کنیزیں ہیں جن میں ہر ایک کے پاس وافر زیورات ہیں ۔ یہ سب حاضر کرو' اس کے بعد اگر ضرورت باقی رہے تو میں ٹیکس لگانے کے فتویٰ پر دستخط کر لوں گا۔ اس حق گوئی کے جرم میں امام نوویؒ کو جلا وطن کر دیا گیا (ترجمہ امام نووی' علامہ سخاویؒ)

۲ ۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ٹیکسوں کا نظام ایسا بنایا جائے کہ غریب عوام پر اور عام صارفین پر بوجھ نہ پڑے' بلکہ معاشرے کے اغنیاء کی فاضل دولت پر یہ بوجھ ڈالا جائے ۔

۳ ۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ٹیکسوں سے حاصل کردہ رقوم عوام کی بہبود و سہولت پر خرچ کی جائیں یعنی مصالحِ عامہ پر خرچ کی جائیں' خواہ ترقیاتی منصوبے ہوں یا انتظامی اخراجات یا دفاعی

اخراجات ' خرچ میں اسراف و تبذیر سے بھی اجتناب کیا جائے ' اور عوام کو سہولتیں فراہم کرنے میں بخل سے بھی اجتناب کیا جائے ' بلکہ اقتصاد و اعتدال پر عمل کیا جائے۔ غیر اسلامی پروگراموں کے لیے ' یا مخصوص قسم کے مراعات یافتہ طبقے کو سیاسی رشوتیں دینے کے لیے ' یا حکمرانوں کی شخصی خواہشات پوری کرنے کے لیے ' نہ ٹیکس لگانا جائز ہے اور نہ ان کاموں پر خرچ کرنا جائز ہے۔

۴ - چوتھی شرط یہ ہے کہ ہر قسم کے ٹیکس اور قومی محصولات مجلسِ شوریٰ کے مشورے اور فیصلے کے عین مطابق عائد کیے جائیں۔ اسلامی نظام ایک شورائی نظام ہے جس میں ہر قسم کے قومی فیصلے مسلمانوں کے معتمد نمائندوں (اہلِ حل و عقد) کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ امیر کو شوریٰ کے فیصلے کے خلاف ویٹو کا حق حاصل نہیں ہے ' اِلّا یہ کہ اس کے پاس قرآن و حدیث کی واضح دلیل موجود ہو۔

(۱۱)۔ وراثت کے شرعی احکام کا نفاذ

حلال طریقے پر مال و جائیداد حاصل کرنے اور تمام مذکورہ حقوق واجبہ ادا کرنے کے بعد بھی اگر مال حلال منقولہ یا غیر منقولہ بچ جائے تو یہ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اپنے پس ماندگان کو اغنیاء چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو ان کو دوسروں کا محتاج چھوڑ دے۔ ارتکاز کے خاتمے اور دوسری مصالح کے لیے شریعت میں وراثت کا مکمل نظام موجود ہے۔ میت کے ترکے میں بیٹوں کا بھی حصہ ہے اور بیٹیوں کا بھی ۔ اگر شرعی احکام کے مطابق میراث تقسیم کی جائے تو اس سے ارتکازِ دولت میں معتدبہ کمی آجائے گی ۔